اردو کا ارتقاء
ایک اسلامی زبان کی شکل میں

پروفیسر اقتدار حسین صدیقی

عربی زبان کے بعد فارسی اور ترکی زبانوں کی طرح اردو اور ملیشین زبانوں کو بھی اسلامی زبانیں ہونے کا شرف حاصل ہے۔ آخرالذکر زبانوں میں بھی اسلامی ادب کا گرانقدر ذخیرہ موجود ہے۔ دراصل دنیا کے مختلف حصوں میں رہنے والے مسلمانوں کی اکثریت ان ہی زبانوں کو بولتی ہے۔ جنوبی ایشیا کے ممالک، ہندوستان اور پاکستان میں مسلمانوں اور اسلام کی تاریخ پر تحقیق اور تصنیف کے لیے اردو زبان سے واقفیت ضروری ہے۔ اسی طرح ملیشیا اور انڈونیشیا میں اسلام کی اشاعت اور توسیع کے مطالعہ کے لیے ملیشین زبان کا جاننا ضروری ہے۔ لیکن دوسری زبانوں کے برخلاف جنوبی ایشیا میں اردو کو فارسی کی بجائے اسلامی زبان کا مرتبہ حاصل کرنے میں صدیاں لگیں۔ تاریخی شواہد کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ باہر سے آکر ہندوستان میں بسنے والے مسلمانوں نے ہندوستان کے مختلف علاقوں میں وہاں کی بولیوں کو اپنا لیا تھا اور یہ عمل اُن کا سلطنت دہلی کے وجود میں آنے سے تقریباً کئی سو سال پہلے شروع ہو گیا تھا۔ مسلمان مختلف علاقوں کی مختلف بولیوں کو صرف ایک ہی نام ہندوی سے موسوم کرتے تھے۔ خواہ وہ پنجابی ہو یا گجراتی (گوجری)[1]

---

[1] سدید الدین محمود عوفی جو بخارا کے رہنے والے تھے اور ۱۲۲۱ء کے بعد مشرق وسطیٰ کے ممالک کی سیر کرنے کے بعد جہاز کے ذریعہ گجرات پہنچے تھے۔ گجرات کی بندرگاہ کھنبایت میں انھوں نے وہاں کے مقامی تاجروں کے یہاں قیام کیا۔ انھوں نے کھنبایت کی مسلم آبادی کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں کہ مسلمان تجارت کرتے ہیں۔ ہندو راجہ نے ان کو مکمل مذہبی آزادی دے رکھی ہے۔ حنفی مسلمانوں کی تعداد بھی کافی ہے جن کی دینی رہبری کے لیے خود عوفی قاضی مقرر ہو گئے تھے۔ اُن کے بیان سے یہ بھی =

۱۱۹۳ء میں دہلی کی فتح کے بعد دہلی اور اس کے گرد و نواح میں باہر سے آئے ہوئے مسلمان کثیر تعداد میں آباد ہوئے۔ یہ نووارد لوگ فارسی زبان بولتے تھے۔ لیکن علاقہ کے قدیم باشندوں سے ربط قائم کرنے کے سلسلے میں مقامی بولی کو سیکھنا ضروری تھا تاکہ مفتوحہ لوگوں سے گفت وشنید کے ذریعہ سلطنت کے نظم ونسق میں مدد مل سکے۔ دہلی اور اس کے قرب وجوار میں برج بھاشا کا اثر تھا۔ جب مسلمانوں نے اس کو بولنا شروع کیا تو اس میں فارسی اور عربی الفاظ شامل ہونے لگے۔ رفتہ رفتہ الفاظ کی آمیزش سے ایک نئی بولی کی شروعات ہوئی اس کو بھی مسلمانوں نے ہندوی کا ہی نام دیا۔ صوفیائے کرام نے نومسلم مریدوں کی تربیت اور آسانی کے لیے اپنی خانقاہوں میں اس کو اپنایا۔[۱] غرض کہ سو سال کے اندر ہی یہ بولی مقبول ہوگئی اور عوام کی طرح خواص بھی اسے بولنے لگے۔ اگرچہ مسلمانوں کی علمی اور ثقافتی زبان فارسی ہی رہی۔

چودھویں صدی عیسوی کے آغاز پر جب دہلی سلطنت کی توسیع گجرات اور دکن میں ہوئی تو دہلی کی فوجوں اور انتظام حکومت سے متعلق لوگوں کے ساتھ دہلی میں بولی جانے والی ہندوی بھی ان علاقوں میں پہونچی۔ اس توسیع کے ساتھ ساتھ دہلی سے وہاں جانے والے مسلمانوں

= معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان وہاں بہت پہلے سے رہ رہے تھے۔ عوفی کے گجرات پہنچنے سے بہت پہلے پارسیوں کے ورغلانے پر مقامی ہندوں نے کھنبایت میں مسلم آبادی پر حملہ کر کے اسّی مسلمانوں کو شہید کر دیا اور ان کی شاندار مسجد اور اس کے مینارہ کو منہدم کر دیا۔ اس پر مسلمانوں کے خطیب نے جن کا نام علی تھا کھنبایت سے راجدھانی انہلواڑہ کا سفر کیا اور وہاں پر راجہ کو ایک قصیدہ کے ذریعہ جو کہ راجہ کی زبان یعنی گوجری یا گجراتی میں تھا پورے واقعہ کی اطلاع دی۔ راجہ نے ذاتی طور پر کھنبایت جا کر واقعہ کی تفتیش کی مجرموں کو موت کی سزا دی اور مسجد کو ازسرنو تعمیر کرنے کے لیے رقم دی۔ عوفی نے خطیب کے قصیدہ کی زبان کو گوجری کے بجائے ہندوی بتایا ہے۔ بابا فریدالدین گنج شکر کی پنجابی شاعری کا بھی عہد وسطیٰ کے مورخین ہندوی شاعری کے نام سے ذکر کرتے ہیں۔ اسی طرح امیر خسرو دیباچہ غرۃ الکمال میں سعد سلمان کے بارے میں کہتے ہیں کہ انھوں نے فارسی کے علاوہ ہندوی میں بھی اپنا دیوان مرتب کیا تھا۔

سدیدالدین محمد عوفی، جوامع الحکایات و لوامع الروایات، مرتبہ محمد نظام الدین حیدرآباد ۱۹۶۶ء ۲/۱ صفحہ ۲۵

[۱] راقم الحروف کی کتاب Islam and Muslims in South Asia: Historical Perspective Delhi 1984 P. 1987, Delhi 1984 P. 71

کی آبادی بڑھتی رہی۔ مذہبی رہبری اور تعلیمی ضروریات کی تکمیل کے لیے وہاں علما اور مشائخ بھی پہونچے۔ سلطان محمد بن تغلق نے ۱۳۲۷ء میں دہلی کی پوری مسلم آبادی جو کئی لاکھ پر مشتمل تھی دکن میں دولت آباد منتقل کردی۔ سلطان کا مقصد دہلی کی طرح دکن کو بھی مسلم تہذیب کا مرکز بنانا تھا تاکہ اس کی وجہ سے وہاں اس کی حکومت مستحکم ہو سکے۔ اس حکمتِ عملی کا ہندوی کے حق میں خوشگوار نتیجہ برآمد ہوا۔ کیونکہ دہلی کے قدیم باشندوں نے دکن میں اپنی ہندوی کو محفوظ رکھا حالانکہ اُن کے علاقوں میں جو زبانیں بولی جاتی تھیں وہ قدیم مراٹھی، تیلگو اور کنڑ زبانیں تھیں جو کہ شمالی ہند کی بولیوں سے بالکل مختلف تھیں اسی طرح گجرات میں بھی دہلی کی ہندوی محفوظ رہی وہاں مسلمان گوجری کی بجائے اپنے گھروں میں ہندوی بولتے رہے۔ دکن میں بولی جانے والی ہندوی جس کو دکنی اردو کہتے ہیں اور گجرات کی قدیم ہندوی کے نمونے اردو زبان کی تاریخ کے طالب علم کے لیے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان سے اردو کی نشو ونما پر اچھی روشنی پڑتی ہے۔ ذیل کی سطور میں دہلی میں بولی جانے والی ہندوی کے جس کو ابو الفضل نے دہلوی کے نام سے موسوم کیا ہے اور جو انیسویں صدی میں اردو کہلائی ارتقا، کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔

اگرچہ امیر خسرو کے دیباچہ غرۃ الکمال میں ہندوی شاعری کے رواج کا ذکر کیا ہے اور اس سے فارسی بولنے والے مسلم حکمرانوں میں اس کی مقبولیت کا بھی اندازہ ہوتا ہے لیکن ہندوی کے الفاظ اور جملے چودھویں صدی عیسوی کی کتابوں میں ملتے ہیں۔ ان الفاظ اور جملوں کی اہمیت اس لیے ہے کہ ہندوی کی تاریخ مرتب کرنے میں ان سے مدد ملتی ہے۔ اس سلسلے میں شعرا کے دواوین کے علاوہ ہندوستان میں لکھے گئے صوفیا کرام کے ملفوظات اور فارسی کی لغات بہت اہم ہیں۔ مثال کے طور پر شیخ نصیر الدین چراغ دہلیؒ کے ملفوظات 'خیر المجالس' میں ہندوی الفاظ اور جملے ملتے ہیں۔ ایک مرتبہ شیخ نے مریدوں سے گفتگو کرتے ہوئے فرمایا کہ سوداگروں کے گھر کے دو حصے ہوتے ہیں ایک اندرونی یعنی زنانخانہ اور دوسرا باہری جو کہ دوکان کا کام دیتا ہے کیونکہ اس میں خرید و فروخت سے متعلق باتیں ہوتی ہیں۔ ایک دن زنانخانہ سے باہری حصہ میں کنیز آئی اور کہا "خواجہ طعام رسیدہ است (کھانا آرہا ہے)، نہاری بیارم" سوداگر نے ہندوی میں کہا "رہ رہ" (یعنی ٹھہرو)[1]۔ اسی طرح

---

[1] حمید قلندر، خیر المجالس، علی گڑھ، ۱۹۵۹ء، ص ۹۳

ایک دن مریدوں کو بتایا کہ حضرت موسیٰؑ کے زمانہ میں ایک بت پرست تھا جو کہ والہانہ عشق کے ساتھ اپنے بت کی پرستش کرتا رہا۔ ایک دن وہ شدید بخار میں مبتلا ہوگیا۔ بخار کی تپش سے آرام پانے کے لیے اُس نے بُت سے رجوع کیا یہ کہتے ہوئے "تو میر اگسائیں توں میرا کرتار، مجھ اُس تاپ تھیں چھڈا۔" جب بُت سے کوئی جواب نہیں ملا اور بخار کی تپش میں اضافہ ہونے لگا تو اس نے بت کو ٹھوکر مار کر پھینک دیا اور کہا "تو کرتار نہیں"۔[1]

شیخ نظام الدین اولیاؒ کی بدایوں میں دستارِ فضیلت کی رسم کا ذکر کرتے ہوئے اُن کے خلیفہ شیخ نصیر الدین چراغ دہلی فرماتے ہیں کہ دستار فضیلت باندھنے کی رسم کے سلسلے میں دعوت کا انتظام کیا جاتا تھا اور اس میں عمائدین شہر کو مدعو کیا جاتا تھا۔ اس زمانہ میں بدایوں میں تقویٰ اور روحانی صلاحیت کی بنا پر نو مسلم درویش مسمیٰ علی مولا کا بڑا احترام کیا جاتا تھا۔[2] علی مولا ہندو نژاد ہونے کی وجہ سے فارسی سے نابلد تھے اور مقامی زبان بولتے تھے۔ شیخ نظام الدین اولیاء کے استاد مولانا علاء الدین اصولی نے ان کو مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے بلایا اور شیخ کے سر پر دستار باندھنے کے لیے بھی انھیں سے درخواست کی جب وہ دستار باندھ رہے تھے تو اچانک مولانا سے پکار کر کہا "مولا نا یہ بڑا ہوسی۔ یعنی ای مولانا ایں مرد بزرگ خواہد شد" مولانا نے علی مولا سے پوچھا کہ "آپ کیسے کہتے ہیں؟ جواب دیا "چو منڈا سا باندھی سو پائن پسری۔ یعنی آں کہ دستار بر سر بندد او در پای کسی افتد" اور پھر مزید کہا "کہ در دستار او ابریشم نیست، دستار سادہ است' ایں بزرگ خواہد شد"۔[3]

---

[1] ایضاً ص ۱۲۳

[2] شیخ علی مولا کا ذکر شیخ نظام الدین اولیاء کی ملفوظات فوائد الفواد میں بھی ملتا ہے لیکن شیخ نصیر الدین چراغ دہلی نے زیادہ تفصیل فراہم کی ہے۔ ابتدا میں علی مولا ڈاکو تھے۔ ایک دن انھوں نے بدایوں میں شیخ جلال الدین تبریزی کو دیکھا جب شیخ کی نظر اُن پر پڑی تو وہ شیخ کے قدموں پر گر پڑے۔ اُن کے ساتھ رہنے لگے۔ مسلمان ہو کر ریاضت اور مجاہدہ میں مصروف ہو گئے۔ جب شیخ جلال الدین تبریزی نے بدایوں سے بنگال کے لیے ہجرت کی تو علی مولا کو اپنے جانشین کی حیثیت سے بدایوں میں قیام کا حکم دیا۔

حمید قلندر، خیر المجالس، مرتبہ خلیق احمد نظامی، علی گڑھ، ۱۹۵۹ء، ص ۱۹۱ تا ص ۱۹۲۔ [3] ایضاً ص ۱۹۱

شیخ نظام الدین اولیاء کے ہم عصر ایک عالم کے بارے میں شیخ شرف الدین یحییٰ منیری فرماتے تھے کہ مولانا علاء الدین دہلی میں رہتے تھے وہ تفسیر، حدیث، فقہ، نجوم، منطق وغیرہ کا درس دیتے تھے۔ جب شہر کے علما اور مشائخ کو دربار شاہی میں مدعو کیا جاتا تھا تو منادی ہوتی تھی۔ وہ اطلاع پاکر یہ کہہ کر جانے سے منع کر دیا کرتے تھے جو ہو سو ہو۔[1]

شیخ نظام الدین کے دوسرے خلیفہ شیخ برہان الدین غریبؒ اپنے پیر کی ہدایت پر دعوت و تبلیغ کے لیے دہلی سے دولت آباد (دکن) جاکر مقیم ہوئے۔ وہ دولت آباد میں مریدوں سے ہندوی ہی میں گفتگو کرتے تھے جیسا کہ اُن کی ملفوظات 'احسن الاقوال' سے معلوم ہوتا ہے۔ اس میں بہت سے ہندوی الفاظ بھی ملتے ہیں جیسے کھٹ (چارپائی) کھچڑی، ڈولہ چھجہ، اس کے علاوہ ایک ہندوی دوھا بھی ملتا ہے۔[2]

بابائے اردو مولوی عبدالحق نے اردو کی ترقی میں صوفیائے کرام کے رول پر بڑی دیدہ ریزی سے تحقیق کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں "دیوی کو ہاتھ میں لانے کے لیے سب سے پہلے ہم زبانی لازم ہے۔ ہم زبانی کے بعد ہم خیالی پیدا ہوتی ہے۔ درویش کا تکیہ (یعنی خانقاہ) سب کے لیے کھلا تھا۔ بلا امتیاز ہر قوم و ملت کے لوگ اُن کے پاس آتے اور اُن کی زیارت اور صحبت کو موجب برکت سمجھتے۔ عام و خاص کی کوئی تفریق نہ تھی۔ خواص سے زیادہ عوام اُن کی طرف جھکتے تھے۔ اس لیے تلقین کے لیے انھوں نے جہاں اور ڈھنگ اختیار کیے اُن میں سب سے مقدم یہ تھا کہ اس خطے کی زبان سیکھیں تاکہ اپنا پیغام عوام تک پہنچا سکیں۔[3]

یہ بیان کسی حد تک صحیح ہے لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ شیخ برہان الدین غریب یا سید محمد گیسو دراز یا دوسرے صوفیا، جو دہلی سے دکن اور گجرات گئے وہ اپنی زبان یعنی دہلی کی ہندوی لے کر گئے تھے اور اپنی خانقاہ میں آنے والوں سے فارسی یا ہندوی میں

---

[1] زین بدر عربی، خوانِ پرنعمت، پٹنہ، ۱۳۲۱ھ ص ۱۱۱

[2] حماد بن عماد کاشانی۔ احسن الاقوال۔ مخطوطہ، یونیورسٹی کلکشن، مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ۔ فارسیہ مذہب تصوف نمبر ۳۱۸۔

[3] مولوی عبدالحق۔ اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام۔ مطبوعہ یونین پریس دہلی۔ ص ۸

گفتگو کرتے تھے۔ دونوں علاقوں میں ہندوی مسلمانوں کی زبان تھی۔ دوسرے یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ صوفیا عیسائی مبلغین کی طرح کام نہیں کرتے تھے یعنی وہ غیر مسلموں تک پہونچ کر انھیں دعوتِ اسلام نہیں دیتے تھے۔ وہ اپنی خانقاہوں میں رہتے تھے اور مسلمانوں میں مریدی کے ذریعہ دینداری کا جذبہ پیدا کرنا ان کا مقصد ہوتا تھا۔ اگر کوئی غیر مسلم اُن کے پاس آتا تھا تو اس کے ساتھ بہت محبت اور ہمدردی سے پیش آتے تھے۔ ایسے ہندوؤں میں سے کچھ کا شیخ سے متاثر ہو کر اسلام قبول کرنا بعید از قیاس نہیں ہے لیکن کوئی تاریخی شہادت ایسی نہیں ملتی کہ دہلی سے گئے ہوئے کسی صوفی نے گوجری، تیلگو، کنڑ یا مراٹھی سیکھی ہو۔

شیخ برہان الدین غریبؒ کے بعد دوسرے اہم صوفی بزرگ جو دہلی سے ہجرت کر کے دکن میں جا کر گلبرگہ میں مقیم ہوئے وہ سید محمد حسینی گیسو دراز تھے۔ ان کی بول چال کی زبان بھی ہندوی تھی اور اسی میں وہ گفتگو کرتے تھے۔ جوامع الکلم ان کے ملفوظات کا مشہور مجموعہ ہے۔ احسن الاقوال کی طرح اس میں بھی ہندوی الفاظ ملتے ہیں۔ اس میں لکھا ہے کہ شیخ کی مجلس میں ایک دن ایک ہندو طبیب مسمی بُھنّو مولانا جمال الدین سے ملاقات کرنے کی غرض سے آئے۔ گفتگو کے دوران مولانا صدرالدین نے ہندو طبیب کو "ابے بُھنّو" کہہ کر مخاطب کیا۔ اس پر مولانا جمال الدین ناراض ہو کر بولے "ابے کیا ہوتا ہے" ان کو تمہیں "برادر بُھنّو" کہہ کر مخاطب کرنا چاہیے تھا۔[1]

اردو زبان کے ارتقار کی تاریخ مرتب کرنے کے سلسلے میں چودھویں صدی سے ہندوستان میں لکھی ہوئی فارسی لُغات کا بھی مطالعہ ضروری ہے۔ اِن لغات میں قدیم اور مشکل فارسی الفاظ اور اصطلاحات کے معنی بیان کرتے ہوئے مولفین نے ہندوستانی قارئین کی سہولت کے لیے فارسی الفاظ کے ساتھ اُن کے ہم معنی ہندوی الفاظ بھی دیئے ہیں۔ علاوہ ازیں فارسی کی ایسی اصطلاحات بھی ملتی ہیں جن کو نظم و نسق کے سلسلے میں مسلمانوں نے ہندوستان میں اختراع کیا تھا۔ یہ اصطلاحات ہندوستان سے باہر کے فارسی لٹریچر میں بالکل نہیں ملتیں لیکن اردو میں آ کر زبان زد ہو گئی ہیں۔ مثال کے طور پر زمیندار۔

ہندوستان میں لکھی گئی لُغات میں سب سے قدیم لغت "فرہنگ قواس" بمتیاب

---

[1] سید محمد اکبر حسینی، جوامع الکلم، کانپور، ۱۳۵۶ھ، صـ ۱۷۲

ہوئی ہے۔ یہ فرہنگ قواس سلطان علاء الدین خلجی کے عہد (۱۲۹۶ء تا ۱۳۱۶ء) میں لکھی گئی تھی۔ اس کے مؤلف مولانا فخر الدین مبارک شاہ قواس غزنوی تھے۔ مولف کے نام ہی سے اس کو فرہنگ قواس کہا گیا ہے[۱]۔ اس میں قدیم فارسی الفاظ کے مترادفات کے طور پر ہندوی الفاظ "پنکھا" کھیل، چھپر، گالہ، لڈو وغیرہ ملتے ہیں۔ کیارنگ کا فارسی زبان میں مطلب بیان کرتے ہوئے صاحب لغت لکھتے ہیں کہ فارسی میں کیارنگ کے معنی مرزبان اور شحنۂ ولایت کے ہیں لیکن ہندوستان میں کیارنگ کا مقابل زمیندار ہے۔ یعنی وسط ایشیا اور ایران میں کیارنگ، شحنہ وغیرہ اُس رئیس کو کہتے تھے جو کہ ایک بڑے علاقے کا مالک اور حکمراں ہوتا تھا اور یہ اس کو وراثت میں ملتا تھا۔ اسی طرح دہقان کا مطلب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ دہقان گاؤں کا وہ فرد ہے جس کو حکومت گاؤں کے بندوبست اور لگان کی وصولیابی میں مدد دینے کے لیے مقرر کرتی ہے۔ ہندوستان میں دہقان کو خوط کہتے ہیں[۲]۔

فرہنگ قواس کے بعد سلطان محمد بن تغلق کے عہد میں حاجب خیرات معروف دہلوی نے دستور الافاضل مرتب کی۔ دستور الافاضل میں ہندوی کے الفاظ زیادہ ملتے ہیں۔ اس میں اذدب کے ہندوی معنی مکھی دئے ہیں۔ ہدل کے معنی گیاہ تلخ بتاتے ہوئے اس کا ہندوی مترادف لگروندہ دیا ہے۔ کھٹ کا ترجمہ چارپائی سے کیا ہے۔ مسک کے معنی میں "گوکھرو" دیا ہے۔ ام غیلان کے معنی میں اس کا ہندوی مقابل "کیکر" دیا ہے۔ بلادر کے معنی "بھلانواں" بتائے گئے ہیں[۳]۔

---

[۱] فرہنگ قواس۔ مرتبہ ڈاکٹر نذیر احمد۔ بنیاد فرہنگ ایران، طہران، ۱۹۷۳ء

[۲] تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجئے راقم الحروف کا انگریزی مقالہ
Historical Significance of the Fourteenth Century Farhang Literature of the Delhi Saltanate Period, Indo-Iranica, Calcutta Vol. 32. nos. 3-4, September-December, 1979, PP. 9-21

[۳] حاجب خیرات دہلوی معروف۔ دستور الافاضل، مرتبہ نذیر احمد، بنیاد فرہنگ ایران، طہران، ۱۹۷۳، ص ۶۵، ۹۷ وغیرہ۔

پندرہویں صدی عیسوی میں لکھی گئی فرہنگوں میں ہندوی الفاظ زیادہ کثرت سے استعمال ہونے لگے تھے۔ اس عہد کی فرہنگوں میں محمد بن تغلق بن رستم کی تالیف "بحر الفضائل" بدر دہلوی کی "ادارۃ الفضلاء" بدر ابراہیم کی "زفان گویا" اور محمود بن ضیاء کی "تحفۃ السعادۃ" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان سے اردو الفاظ کے املا کا مطالعہ بھی بخوبی ہو سکتا ہے۔[1]

پندرہویں صدی کے ہندوستانی فارسی لٹریچر کے مطالعہ سے یہ تاثر ملتا ہے کہ عوام کی طرح مسلم خواص بھی گھروں میں ہندوی بولنے لگے تھے۔ عربی مذہبی اور فارسی ادبی زبان ہو کر رہ گئی تھی۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ۱۳۹۸ء میں دہلی اور مغربی یوپی تیمور کے حملہ کی وجہ سے بُری طرح تاراج ہو گئے تھے اور دہلی کے دانشور ہجرت کر کے جونپور، مانڈو (مالوہ) احمد آباد گجرات اور گلبرگہ (یعنی دکن) میں آباد ہو گئے تھے۔ ان مہاجرین کے ساتھ ہندوی یا قدیم اردو بولنے والوں کی مختلف علاقوں میں تعداد خاطر خواہ بڑھی۔ اسی وجہ سے اردو کی نشو و نما کا مطالعہ کرنے میں گجرات اور دکن کے صوفیاء کے ملفوظات کے مجموعے بہت معاون ہیں۔

برخلاف گجرات اور دکن کے مسلم اشراف نے پوربی علاقہ میں جس سے ہماری مراد موجودہ زمانہ کے اُن اضلاع سے ہے جو کہ مشرقی یوپی میں شامل کیے جاتے ہیں اور جن کے نظم و نسق کے سلسلے میں کڑہ، اودھ اور بنارس شہروں کو صوبائی مراکز بنایا گیا تھا اپنی دہلی کی ہندوی کو چھوڑ کر اظہار خیال کے لیے وہاں کی مقامی بولی (Dialect) اودھی کو اپنا لیا تھا۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ تیرھویں اور چودھویں صدی میں ان علاقوں میں دہلی سے گئے ہوئے مسلمانوں کی تعداد بہت زیادہ نہ ہو سکی اور ہندوؤں میں اسلام کی اشاعت اور تبلیغ کا کام بھی زیادہ پیمانہ پر نہیں ہوا۔ دوسرے اودھی اور دہلی کی ہندوی میں جو کہ برج بولی سے متاثر تھی بہت زیادہ فرق بھی نہیں ہے جتنا فرق گجرات میں گجراتی، دکن میں تیلگو اور کنڑی اور مراٹھی میں ہے۔ لہٰذا چودھویں صدی عیسوی کی آخری دہائیوں سے مسلم صوفیاء نے اودھی میں مثنویاں لکھنی شروع کر دی تھیں۔ اس عہد کی مشہور مثنوی مُلّا داؤد کی چندائن

---

[1] فرہنگ زفان گویا کو ڈاکٹر نذیر احمد نے دو جلدوں میں مرتب کیا ہے۔ ابھی جلد اول خدا بخش لائبریری پٹنہ سے شائع ہوئی ہے۔ سن طباعت ۱۹۸۹ ہے۔ لیکن دوسری لغات ہندوستان اور انگلینڈ کی لائبریریوں میں مخطوطات کی شکل میں ملتی ہیں۔

ہے۔ اس میں لورک اور چندا کے عشق کی داستان کو نظم کیا گیا ہے۔ کیونکہ اشعار عشق مجازی کی تاثیر اور روحانی زندگی میں اس کی اہمیت کی تائید کرتے ہیں اس لیے یہ مثنوی صوفیاء میں بہت مقبول ہوگئی۔ کچھ غیر صوفی عالم بھی جو تصوف سے متاثر تھے وہ اپنے وعظ کے دوران اس کے اشعار پڑھتے تھے۔ ملا عبدالقادر بدایونی کے مطابق اُن کے عہد یعنی سولہویں صدی عیسوی میں واعظ اور علماء اپنی تذکیر اور وعظ کو موثر بنانے کے لیے چندائن کے اشعار موقعہ بموقعہ سناتے تھے۔ مخدوم شیخ تقی الدین، بانی کے متعلق لکھتے ہیں کہ وہ جمعہ کے دن منبر سے وعظ کے دوران چندائن کے اشعار پڑھتے تھے[1] اسی طرح بعد میں لکھی ہوئی مشہور مثنویاں" پدماوت اور مدومالتی جن کو شیر شاہ سور اور اسلام شاہ سور کے عہد میں ملک محمد جائسی اور میر سید منجھن نے لکھا تھا اودھی زبان ہی میں ہیں۔ ان کے لکھنے میں بھی دونوں شاعروں کے ہاں عشق مجازی کی صداقت کا تصور کارفرما نظر آتا ہے۔

مذکورہ بالا مثنویوں کو اردو والوں کی بجائے ہندی والوں نے اپنایا اور ان کو فارسی رسم الخط سے بدل کر دیوناگری رسم الخط میں چھپوایا ہے۔ حالانکہ ان میں کثرت سے عربی اور فارسی الفاظ ملتے ہیں علاوہ ازیں ان کی ترتیب فارسی مثنوی کے انداز پر ہے۔ ہر مثنوی حمد سے شروع ہوتی ہے۔ حمد کے بعد نعت شریف اور منقبت ہے۔ پھر شاعر اپنے پیر اور بادشاہ وقت کی تعریف میں اشعار لکھتا ہے۔ مثلاً ملک محمد جائسی پدماوت میں شیر شاہ سور کی عظمت، اس کے تلوار چلانے کی صلاحیت، اس کی عقل سلیم، اُس کی زبردست فوج و اُس کے غیر جانبدارانہ عدل کے بارے میں رطب اللسان ہے۔ وہ شیر شاہ کو عدل کے معاملے میں حضرت عمر فاروقؓ کا پیرو بتاتا ہے۔ یہ شاعرانہ مبالغہ آرائی نہیں کہا جاسکتا ہے کیونکہ شیر شاہ کے ہم عصر اور اکبر کے عہد کے مورخین بھی اس سلسلے میں جائسی کے ہمنوا ہیں۔ میر سید منجھن کی مدومالتی میں بھی حمد، نعت اور منقبت کے بعد شاعر کے پیر اور بادشاہ وقت اسلام شاہ بن شیر شاہ سور کی مدح کی گئی ہے[2]۔

دہلی جو کہ سلطنت کا دارالخلافہ تھا اور جہاں پر مسلم ثقافت ۱۳ ویں صدی سے ترقی

---

[1] عبدالقادر بدایونی، منتخب التواریخ، جلد اول۔ صفحہ ۲۵

[2] مدھومالتی۔ مرتبہ ڈاکٹر ماتا پرشاد گپتا۔ الہ آباد، ۱۹۶۱ء

کرکے چودھویں صدی کے اوائل میں اپنے نقطۂ کمال کو پہنچ گئی تھی اس کو اور اس کے قریب مغربی یوپی کے علاقہ کو ۱۳۹۸ء میں امیر تیمور نے تباہ و برباد کر دیا تھا۔ اس تباہی کا اثر دہلی اور مغربی یوپی پر پچاس سال تک رہا۔ دہلی ویران ہی رہا۔ لیکن پندرہویں صدی کے نصف اول کے خاتمہ کے بعد ۱۴۵۱ء میں بہلول لودی کا دہلی کے تخت پر قبضہ کرنے سے دہلی اور اس کے گردونواح کے علاقہ کی معاشی اور ثقافتی ترقی کے لیے دوبارہ حالات سازگار ہوئے۔ رفتہ رفتہ دہلی نے اپنی کھوئی ہوئی عظمت حاصل کرنی شروع کر دی۔ بہلول کے بیٹے سلطان سکندر لودی کا عہد (۱۴۸۸ تا ۱۵۱۷ء) کو علم و ادب کے فروغ کے لیے عہدِ زریں تصور کیا جاتا چاہیے۔ سلطان کی علم دوستی کی شہرت سے ہندوستان اور بیرونی ممالک سے علماء و فضلاء اور اہل دانش ہجرت کر کے دہلی اور آگرہ میں بس گئے اور اُن کی موجودگی نے ان شہروں کو علم و فضل کے مراکز میں تبدیل کر دیا۔ سلطان نے فارسی طبیعت کے علاوہ ہندوی کے شعراء کی بھی سرپرستی کی۔ ایسی خوشگوار فضا میں ہندوی شاعری کی مزید ترقی یقینی تھی۔ شاعروں نے اپنی شہرت کے لیے نعتیہ کلام جو کہ بہت مقبول ہوگیا تھا ہندوی میں بھی لکھنا شروع کیا۔

سلطان سکندر لودی کے ندیم اور عظیم شاعر جمالی کنبو کے متعلق ملتا ہے کہ اُن کی نعت جس کا شعر ہے :-

موسیٰ زہوش رفت بیک پرتو صفات
تو عین ذات می نگری در تبسمی

مقبول عام ہوگئی تھی[1]۔ اس کو مزید مقبول بنانے کے لیے جمالی نے اس کا ہندوی میں ترجمہ خود ہی کیا تاکہ قوال محفل سماع میں گا سکیں۔ عبدالقادر بدایونی کے زمانہ میں یہ ہندوی ترجمہ قوالوں کے ذریعہ دہلی اور آگرہ میں مقبول عام ہوگیا تھا[2]۔

لودی سلاطین کے عہد کے فارسی لٹریچر کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مختلف موضوعات پر لکھی جانے والی کتابوں کے مصنفین نے اپنے خیالات کا ہندوی سے فارسی میں ترجمہ کر کے لکھا ہے۔ ان کتابوں میں ہندوی الفاظ کی بھرمار ہے۔ جیسا کہ شیخ رزق اللہ

---

[1] شیخ عبدالحق محدث دہلوی۔ اخبار الاخیار، دہلی ۱۳۳۲ھ ص ۲۲۸

[2] منتخب التواریخ۔ جلد اول ص ۳۲۵

مشتاقی کی تالیف "واقعات مشتاقی" سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس میں بہت سی وہ اصطلاحات بھی ملتی ہیں جو کہ فارسی یا عربی لفظ میں معمولی سی تبدیلی کرکے بنائی گئی تھیں اور وہ مسلمانوں میں روزمرہ کے طور پر استعمال ہونے لگی تھیں۔ مثلاً جمعہ کے دن مسلمان نماز کے بعد مسجد سے گھر واپسی پر فقراء میں روپیہ بانٹتے تھے اس کو جمعگی کہتے تھے۔ دوسرے برج کی شاعری کے اثر سے ہندوی میں ایک نئی صنف سخن کا آغاز ہوا اور اس کا اصل نام کھڑک یا کھڑکا ہی رہا۔ یہ چند مصرعوں پر مشتمل ہوتی تھی۔ ہندؤں کی طرح مسلمان بھی امراء اور رؤسا کی شان میں کھڑکا لکھ کر سنانے لگے۔ اس ضمن میں مشتاقی سلطان سکندر کے ایک امیر کا ذکر کرتے ہیں جو کہ سلطان کا معتمد ندیم بھی تھا۔ ایک دن ایک شاعر نے اس کی شان میں کھڑک گا کر پڑھا۔ تو اُس نے اس کو بڑا قیمتی گھوڑا جس پر سوار تھا انعام میں دے دیا[۱]۔

اسی عہد میں ایک دوسری صنف سخن کے رواج کا ثبوت ملتا ہے جو کہ ریختہ کے نام سے موسوم ہے۔ اس میں بعد میں غزل بھی کہی جانے لگی۔ لیکن پندرھویں صدی کے شعراء کے ہاں ایسے منفرد اشعار ملتے ہیں جن کا ایک مصرعہ فارسی میں اور دوسرا ہندوی میں ہے۔ اس کی مقبولیت اتنی تھی کہ باہر سے آئے ہوئے لوگ بھی متاثر ہوئے اور انھوں نے اس صنف میں طبع آزمائی کی۔ کیونکہ بابر کی مادری زبان ترکی تھی لہٰذا جب اس نے ریختہ میں شعر کہا تو ایک مصرعہ ہندوی کا دوسرا ترکی کا تھا۔ بابرنامہ میں یہ شعر ملتا ہے۔

مجکا نہ ہوا کچھ ہوس مانک و موتی
فقرا اہلیغہ بس بولغوسید ریانی و روتی

اسی صنف میں لودی سلاطین اور بابر کے ہمعصر صوفی شاعر شیخ عبدالقدوس گنگوہی کا شعر ہے:

صدق رہبر، صبر توشہ، دوست منزل، دل رفیق
ست نگری، دھرم راجہ، جوگ (یوگ) مارگ نرملا[۲]

عشق مجازی کے جواز کا ثبوت شریعت سے فراہم نہیں کیا جا سکتا لیکن یہ ایک واقعہ ہے کہ

---

[۱] واقعات مشتاقی۔ مخطوطہ برٹش لائبریری۔ لندن۔ ورق ۶۷ الف
[۲] شیخ رکن الدین۔ رشد نامہ۔ جھجر ۱۳۱۴ھ ص ۱۵

اس دور کی شاعری اور تصوف میں بعض اوقات عشق مجازی کا تصور بہت ابھرا ہوا ملتا ہے۔ ریختہ کا سب سے اچھا شعر بیرم خاں کا ملتا ہے:

صد بار بگفتم کہ تکرانی (یعنی ٹھکرانی) جیو
یکبار نگفتی کہ پیا پانی پئو

اس شعر کی وجہ تسمیہ کے سلسلے میں دلچسپ تلمیح بیان کی گئی ہے جس سے مقصد عشق مجازی کی تاثیر ظاہر کرنا ہے۔ لکھا ہے کہ جب شیر شاہ سے شکست کھا کر مغل ہندوستان سے بھاگے اور جو بھاگنے میں ناکام رہے وہ گرفتار کر لیے گئے۔ بیرم خاں مالوہ سے شیر شاہ کی قید سے بھاگ کر گجرات پہنچا جہاں پر شیخ گدائی نے اس کی مدد کی۔ گجرات میں اپنے زمانۂ قیام میں بیرم خاں کو خوبصورت مقامات کی سیر کی خواہش ہوئی۔ ایک جگہ اُس نے خواتین کو پانی بھرتے ہوئے دیکھا۔ نزدیک ہی ایک درویش بیٹھا ملا۔ اچانک درویش کی نظر ایک ہندو دوشیزہ پر پڑی۔ اُس کے حسن و جمال سے ایسا متاثر ہوا کہ پہلی ہی نظر میں اس پر فریفتہ ہو گیا۔ درویش دوشیزہ کے قدموں پر گر پڑا اور ہاتھ منہ کی طرف لا کر فریاد کرنے لگا "پانی! پانی!" لڑکی نے ہر چند ڈول سے اُس کے ہاتھوں پر پانی ڈالا لیکن پانی زمین پر گرتا رہا کیونکہ وہ پانی پینے کی بجائے اپنی نگاہ دوشیزہ کے چہرے پر جمائے ہوئے تھا۔ لیکن فریاد "پانی! پانی" برابر کر رہا تھا۔ آخر کار لڑکی ناراض ہو کر گھر چلی گئی۔ درویش بھوکا پیاسا کنوئیں کے پاس پڑا رہا۔ جب لڑکی آتی تھی تو وہ اس کا دیدار کرتا۔ جب درویش کے عشق کا چرچا ہونے لگا تو لڑکی نے گھر سے باہر نکلنا بند کر دیا۔ ہجر کے نتیجہ میں درویش چند دن میں جاں بحق ہو گیا۔ درویش کی موت کے بعد دوشیزہ کے دل پر اثر ہوا لہٰذا وہ اس کی قبر پر آ کر جھاڑو دیتی تھی۔ بیرم خاں تصوف سے دلچسپی رکھتا تھا اور عشق مجازی کی تاثیر کا بھی قائل تھا۔ اس نے اس قصہ کو نظم ہی نہیں کیا بلکہ تلقین اور عبرت کے لیے اکثر اس کا ذکر بھی کرتا تھا۔[۱]

شیخ گدائی جو کہ شیخ جمالی کنبو کے بیٹے اور سہروردی سلسلہ میں باپ کے خلیفہ بھی تھے۔ امراء میں بھی اُن کے مریدوں کی تعداد اچھی خاصی تھی۔[۲] اکبر کے تخت نشین

۱؎ ملا قاطعی ہروی۔ مجمع الشعرای جہانگیر شاہی۔ مرتبہ محمد سلیم اختر۔ دانشگاہ کراچی۔ ۱۹۷۹ء صد ۶۲-۶۹
۲؎ منتخب التواریخ، جلد سوم، صد ۷۶

ہونے پر گجرات سے آگرہ آگئے اور بیرم خاں کے توسط سے صدر کا عہدہ حاصل کیا۔ شیخ گدائی ہندوی اور فارسی میں شعر بھی کہتے تھے[1] عشق مجازی کے بھی قائل تھے۔ غالباً اسی عشق کے اثر سے حسن پسند تھے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی اپنے قارئین کی عبرت کے لیے لکھتے ہیں: با وجود کبر سن در بساتین بہشت آئیں با ماہرویان نازنین گزرانید و چوں نوبت مرگ رسید ہمہ را گذاشت۔ افسوس ہے کہ ہمارے کسی ماخذ میں ان کا ہندوی کا کوئی شعر نہیں ملا۔ ملا قاطعی نے اپنے تذکرہ میں چند فارسی کے اشعار نمونے کے طور پر دیئے ہیں[2]۔

دراصل پندرہویں صدی میں ہندوستان میں ابن العربی کے فلسفہ وحدت الوجود کی عام مقبولیت کی وجہ سے بہت سے نئے تصورات کے ساتھ عشق مجازی کو بھی اہمیت دی جاتی تھی۔ کچھ سنجیدہ اور عالم صوفی بھی عشق مجازی کو عشق حقیقی کے لیے ضروری سمجھنے لگے تھے۔ مثلاً سید محمد گیسو دراز جو ابن العربی کے فلسفہ وحدت الوجود کو غیر اسلامی اور گمراہ کن تصور کرتے تھے عشق مجازی کی برکت اور تاثیر کے قائل تھے جیسا کہ اُن کے مختلف ملفوظات سے ظاہر ہوتا ہے[3]۔ سولہویں صدی میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے چچا شیخ رزق اللہ مشتاقی اور اُن کے چھوٹے بھائی اور محدث صاحب کے والد شیخ سیف الدین دہلی کے جیّد علماء میں شمار ہوتے تھے لیکن صوفی منش ہونے کی وجہ سے عشق مجازی کے قائل تھے۔ شیخ رزق اللہ مشتاقی شاعر بھی تھے۔ محدث صاحب کے مطابق ان کا فارسی اور ہندوی کلام اپنے درد اور سوز و گداز کی وجہ سے دہلی کے اشراف میں بہت پسند کیا جاتا تھا۔ ہندوی میں ان کا تخلص راجن تھا اور فارسی میں مشتاقی۔ ہندوی دیوان کے علاوہ انھوں نے تصوف پر ہندوی میں رسالے بھی لکھے تھے۔ ان رسالوں میں "پیمان" اور جوت نرنجن خاص اہمیت کے حامل تھے[4]۔ ان کی وفات ۹۸۹ھ میں ہوئی تھی۔ رزق اللہ مشتاقی کے ایک ہم عصر صوفی شاعر شیخ برہان الدین۔ ساکن کالپی تھے۔ اُن کے ہندوی

---

[1] اخبار الاخیار ص ۲۲۹ — [2] مجمع الشعرای جہانگیر شاہی۔ ص ۴۷

[3] ملاحظہ کیجئے جوامع الکلم ص ۱۰۰

[4] شیخ عبدالحق محدث دہلوی۔ اخبار الاخیار۔ دہلی ۱۳۳۲ھ ص ۱۷۴

دوہے بہت مقبول ہوئے[1] لیکن دونوں میں سے کسی کا ہندوی کلام دستیاب نہ ہوسکا۔ اگر شیخ رزق اللہ مشتاقی ہی کے رسالے اور شاعرانہ کلام دستیاب ہوجاتے تو دہلی میں بولی جانے والی زبان یعنی دہلوی پر اچھی روشنی پڑسکتی تھی۔

صوفیا رکرام کے ہندوی میں شعر کہنے اور تصوّف پر رسالے لکھنے کی تصدیق ملک محمد جائسی کے بیان سے بھی ہوتی ہے: "ہر یکے از اولیا بدین لسان تکلُّم می فرمودند تاکہ عہد خلافت ایشاں بامحقق و مدقق رسیدوی دریں زبان بسیاری از رسائل وملفوظات فرمودہ"۔

لودیوں کے عہد کی بھکتی تحریک کے رہنماؤں میں صرف کبیر اور نانک کے کلام کے نمونے دستیاب ہیں اور صوفی شعرا میں شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے دوہے اور اشعار رشدنامہ میں ملتے ہیں۔ رشدنامہ کو شیخ کے بیٹے شیخ رکن الدین نے مرتب کیا تھا۔ ایک دوسرے غیر معروف بزرگ شیخ عیسیٰ موانی (افغان) کے ہندوی اشعار نعمت اللہ ہروی کی تالیف تاریخ خانِ جہانی میں ملتے ہیں۔ ہروی لکھتے ہیں کہ عیسیٰ موانی نے تصوّف پر فارسی، پشتو اور ہندوی میں علیحدہ علیحدہ رسالے لکھے تھے۔ اس کے بعد انھوں نے اُن کے فارسی اشعار کے ساتھ ہندوی اشعار نقل کئے ہیں:

کلمی ازلی جو گیا لکھ — اس کارن نکیجی اتا دوکھ
گہر بیٹھی دہ دِسی دام — جو لکھیو تیری نام
جو تو کرسی اللہ یقین — کامل ہوسی تیرا دین[2]

پندرہویں صدی کے ایک بزرگ شیخ عبدالحق صابری ردولوی کی ملفوظات، میں بھی جو کہ شیخ عبدالقدوس گنگوہی کی مرتب کی ہوئی ہے بہت سے ہندوی الفاظ اور جملے ملتے ہیں۔ مثلاً "یک جھلنگہ چارپائی یافتند"۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مسلم اشراف کے گھروں میں مہذب عورتیں ہندوی میں بات چیت کرتی تھیں۔ مثلاً شیخ ایک کوتوال کے یہاں قیام کرتے تو کوتوال کی ماں فجر کے وقت اُن کو ان الفاظ میں

---

[1] شیخ عبدالحق محدث دہلوی، اخبارالاخیار۔ دہلی ۱۳۳۲ھ ص ۲۸۱

[2] نعمت اللہ ہروی۔ تاریخ خانِ جہانی۔ مرتبہ محمد امام الدین۔ جلد دوم۔ ڈھاکہ ۱۹۶۲ء ص ۸۲۵۔

مخاطب کرتی ہے "بٹیا پانی گرم ہے"، یا پھر بھائی اور بھابی کے الفاظ استعمال ہونے لگے تھے۔[1]

اسی عہد میں گجرات کے صوفیا بھی ہندوی ہی میں بات چیت کرتے تھے۔ وہاں کے سہروردی سلسلے کے مشہور بزرگ قطب عالم سید برہان الدین کے متعلق ہے کہ ایک شب جب وہ تہجد کی نماز کے وقت وضو اور استنجا کے لیے باہر تشریف لائے تو اچانک ان کا پاؤں کسی سخت چیز سے ٹکرایا۔ سخت چوٹ لگنے پر وہ بے ساختہ بولے: "لوھ ہے یا لکر یا پتھر ہے۔ یا کیا ہے"۔[2]

گجرات ہی کے دوسرے عالم بزرگ شیخ وجیہ الدین گجراتی کی ملفوظات میں بھی ان کے بولے ہوئے ہندوی کے جملے اور الفاظ کثرت سے ملتے ہیں۔ ان سے بھی گجراتی ہندوی اور دہلوی بولی میں مماثلت ملتی ہے۔ مثال کے طور پر شیخ نے ایک عقیدت مند محمد صالح سے پوچھا کہ کیا وہ شراب پیتا ہے۔ جب اُس نے اثبات میں جواب دیا تو شیخ نے فرمایا: "ولیوں کیا صفتاں ہوتیاں ہیں؟" (یعنی کیا ولیوں میں یہ صفت ہوتی ہے) ایک دن کسی شخص نے کہا کہ شیخ فضل اللہ نے درس و تدریس کا کام بند کر دیا ہے۔ اس پر شیخ نے کہا: "جب ترقی کریں گے اَپن درس کہیں گے۔" ایک شخص نے بتایا کہ شیخ کا فلاں مرید فلاں کام میں الجھ گیا۔ جواب میں کہا: "سب چھوڑ بیٹھے تو شتاب فائدہ ہوجاوے گا"۔ ایک دوسرے مرید کسی ایسے کام میں لگ گئے جو شیخ کو ناپسند تھا لہٰذا جب مرید سے ملاقات ہوئی تو اس سے فرمایا: میاں صبغۃ اللہ چھوڑ دے"۔ ایک مرتبہ کہیں سے گزر ہوا اور راستہ میں ایک شخص ملا۔ اس سے پوچھنے لگے "تمہیں انہار ہتے ہو"۔ ایک مرید نے مجاہدہ اور ریاضت کرنے کی اجازت چاہی تو اس سے فرمایا: "تمہاری بلا ریاضت کرے"۔ ایک دن ایک شخص سے کہا: ناقابل کہیں کا برائے زرشلائین ہو رہا ہے"۔ کسی نے کسی شخص کے بارے میں کہا کہ وہ فلاں چیز قبول نہیں کرے گا۔ شیخ نے جواب میں کہا: "آپیں جھک مار کر قبول کرے گا"۔ ایک دن شیخ علی متقی کے متعلق تعریفاً کہا: شیخ علی کا تقویٰ کہاں، میرا مکان (یعنی مقام) کہاں"۔ ایک دن ایک مرید کو بتایا کہ اگر

---

[1] شیخ عبدالقدوس گنگوہی، انوار العیون، ص ص ۱۲، ۲۱، ۷۰ وغیرہ

[2] سکندر بن منجھو، مراۃ سکندری، بمبئی، ص ۲۵۴

وہ فلاں کام کر بیٹھتا تو اس کا "تقویٰ چھوٹ جاتا"۔[1]

لودی سلاطین کے بعد شیر شاہ سور اور اس کے جانشینوں نے بھی فارسی شعرا اور ادبا کے ساتھ ہندوی زبان کے شعرا کی بھی قدر دانی کی۔ اس عہد کے کچھ امرا بھی ہندوی میں معیاری شعر کہتے تھے اور ان کی سرپرستی میں نامور ہندوی کے شعرا رہتے تھے۔ شیر شاہ سور اور اسلام شاہ سور کے ممتاز امرا میں شاہ محمد مزملی ہندوی کا نامور شاعر تھا۔ شیخ رزق اللہ مشتاقی اور شیخ کبیر تبنی نے اس کی علم دوستی کے متعلق دلچسپ معلومات فراہم کی ہیں۔ شیخ کبیر شاہ محمد مزملی کی مجلس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اس کے حلقۂ احباب میں جنکی وہ سرپرستی کرتا تھا میر منجھن مصنف مدو مالتی اور سور داس شامل تھے۔ شاہ محمد مزملی کا چھوٹا بھائی میاں محسن مزمل بھی ہندوی میں شعر کہتا تھا۔ دونوں شاعر مہمانوں کی تواضع میں بڑی فراخ دلی دکھاتے تھے۔ "دراں کوشکہا پان و غالیہ ہر قسم نہادہ بودند و آنجا بمثل میر سید منجھن مصنف مدو مالتی و شاہ محمد مزمل و محسن برادر خورد شاہ محمد (مزملی) و سور داس وغیرہ علما و فضلا، دراں کوشکہا می بودند و شعرا عربی و پارسی و ہندوی می گفتند"۔[2]

باوجودیکہ شاہ محمد مزملی فارسی اور عربی کے عالم تھے لیکن اُن کا ہندوی کلام اس قدر معیاری تھا کہ مرزا کامران جیسا سخن فہم اور نکتہ سنج بھی خراجِ تحسین دیے بغیر نہ رہ سکا۔ جب مرزا کامران ہمایوں سے شکست کھا کر ہندوستان میں اسلام شاہ سور کے پاس پناہ کے لیے آیا تو اسلام شاہ نے اس کی دیکھ بھال کے لیے نہایت شائستہ امرا کا تعین کیا۔ ان امرا میں شاہ محمد مزملی بھی شامل تھے۔ ایک دن شاہ محمد مزملی کا کلام سن کر مرزا کامران نے کہا: بمثل شما اہلِ فضل و دانش اگر در پارسی شعر گفتی بس در عالم نشانی بماندی" شاہ محمد مزملی نے جواب میں کہا تھا کہ وہ اپنے محبوب کی خاطر ہندوی میں شعر کہتا تھا کیونکہ اس کا محبوب فارسی سے نابلد تھا۔ "بواسطہ او در زبان ہندوی

---

[1] شیخ محمد، ملفوظات شیخ وجیہ الدین گجراتی، حبیب گنج کلکشن، فارسی مخطوطہ نمبر ۲۱/۲۲۱ ورق ۱۲ الف، ۹ الف، ۷ ب، ۸ الف، ۱۱ الف، ۱۲ الف، ۱۰ ب، ۱۳ ب، ۹ ب، ۱۳ ب وغیرہ۔

[2] شیخ کبیر تبنی۔ افسانہ شاہانہ ہند۔ مخطوطہ برٹش لائبریری، لندن، ورق ۱۵۰ ب

وردخود اظہار کردیم ۔ مرزا کامران کو جواب پسند آیا اور اس نے خوب تعریف کی۔ شاہ محمد مزملی کے صرف دو مصرعے ملتے ہیں جوکہ مختلف ہیں

(۱) جم جم الشکن ترت بلم ہردبن ہمات

(۲) تم ہوک جل روپ ہوئے نین نک[1]

سور حکمرانوں کے عہد کے بعد جب مغلوں کے دور کا آغاز ہوا تو نئے حکمراں طبقہ کی جانب سے جس کی مادری زبان فارسی تھی اور جو فارسی ادب کی روایات کا وارث تھا، فارسی شعر و ادب کی سرپرستی اور ہندوی سے بے اعتنائی کا ہونا بڑی حد تک فطری تھا اس کے نتیجہ میں سولھویں صدی کے نصف آخر اور سترھویں صدی میں فارسی زبان میں نہایت معیاری شعری اور نثری شاہکار وجود میں آئے۔ ابو الفضل کی نثر مغل عہد کے دانشوروں کے لیے ایک نمونہ بن گئی جس کا اتباع کرنا بھی علم و ادب کی دنیا میں ایک بڑا کارنامہ تصور کیا جانے لگا۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس وقت تک ہندوی شاعری ہندی مسلمانوں کے کلچر کا حصہ ہو چکی اور یہ کلچرل روایت حکومت کی سرپرستی کی عدم موجودگی میں بھی زندہ رہی۔ اکبر اور جہانگیر کے عہد کے نامور امیر عبدالرحیم خانِ خاناں کے بارے میں مشہور ہے کہ اس کی ملازمت یا سرپرستی میں فارسی شعراء اور ادباء کے ساتھ ہندی اور ہندوی کے شعرا بھی شامل تھے کہا جاتا ہے کہ خانِ خاناں خود بھی ہندی میں دوہے کہتا تھا۔[2] برخلاف شمالی ہندوستان کے دکن میں دکنی اردو برابر ترقی کے منازل طے کرتی رہی وہاں بیجاپور کے عادل شاہی اور گولکنڈہ کے قطب شاہی سلاطین دکنی اردو شعر و ادب کے دلدادہ رہے۔ دراصل شمالی ہندوستان میں ہندوی شعر و شاعری کا نشاۃ ثانیہ اٹھارہویں صدی کے آغاز سے ہوا۔ اس زمانہ میں شاہی دربار اور دانشوروں میں اس کو سرپرستی ملی ۔حضرت مظہر جانِ جاناں اور اُن کے ہم عصر شعراء نے ہندوی زبان کی اصلاح کی اور جلد ہی اس کی نئی شکل ابھری جوکہ اردو کہلانے لگی۔

---

[1] رزق اللہ مشتاقی، واقعات مشتاقی ۔ مخطوطہ برٹش لائبریری، لندن ۔ ورق ۸۱ ب ۔

[2] ملاحظہ کیجئے ایس اے حلیم کا انگریزی مقالہ :

Development of Hindi Literature during Akber's Reilgion
India Quarters, Aligarh, vol III, Nos. 1-2, July-October 1957 PP. 88-99

جہاں تک اردو نثر کی ابتدا اور ترقی کا مسئلہ ہے اس کی باقاعدہ تاریخ اٹھارہویں صدی سے شروع ہوتی ہے۔ اور یہ ترقی بڑی حد تک رہین منت ہے کلکتہ کالج میں اس زبان کے انگریزوں کی دلچسپی اور کاوش کا حکومت کے مفاد کے تحت ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہندوستان میں افسرانِ اعلیٰ نے یہ ضرورت محسوس کی کہ ہندوستانی رعایا سے براہِ راست رابطہ قائم کرنے کے لیے انگریز عہدے داروں کو فارسی رسم الخط میں عام ہندوستانی زبان سکھائی جائے اس غرض سے انھوں نے فارسی کی کلاسیکی کتابوں کا آسان ہندوی میں ترجمہ کرانا شروع کیا۔ اس سلسلے میں میر امن کی باغ و بہار (یعنی قصہ چہار درویش کا ترجمہ) اور مظہر علی خاں عباس سروانی کی تحفۂ اکبر شاہی یا تاریخ شیر شاہی کا ترجمہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ۱۸۰۳ء میں مرہٹوں کی شکست کے بعد انگریزوں کا مغل بادشاہ شاہ عالم سے معاہدہ اور اس کے تحت دہلی اور اس کے متعلقہ علاقہ میں انگریزی عملداری شروع ہوئی تو اس کے ساتھ ساتھ عیسائی مشنری (یعنی مبلغین) بھی وارد ہوئے انھوں نے عیسائیت کی تبلیغ کے لیے بائبل اور اپنے مذہبی لٹریچر کا آسان ہندوی میں ترجمہ کر کے تقسیم کرنا شروع کیا۔ یہ مسلمانوں کے لیے نیا چیلنج تھا۔ لہٰذا شاہ عبدالعزیزؒ کی ترغیب پر قرآن شریف کا عام بول چال کی زبان میں ترجمہ کیا جو مسلمانوں میں بہت مقبول ہوا۔ یہ ترجمہ اردو زبان کی تاریخ میں بڑی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ اس کے بعد اسلام پر ہندوی میں متعدد اور مختلف موضوعات پر کتابیں لکھی جانے لگیں اور جلد ہی یہ زبان اہم اسلامی زبانوں میں شامل ہو گئی۔ دوسری اہم کتاب شاہ اسماعیل شہیدؒ کی تصنیف تقویت الایمان ہے۔ دونوں کاموں کی مقبولیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ وہ اب تک بار بار شائع ہو رہی ہیں۔

یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ شاہ عبدالقادر، شاہ محمد اسماعیل اور سید احمد شہید بریلوی کے رفقاء اپنی تصنیفات کی زبان کو ہندی (ہندوی) کا نام دیتے ہیں۔ اُن کے پیروؤں کا لکھا ہوا لٹریچر اصلاحی اور تبلیغی نوعیت کا ہے۔ کتابوں کی تعداد کافی ہے۔ اس لٹریچر کو ہم دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ پہلے حصہ میں وہ معیاری تصنیفات آتی ہیں جو کہ شاہ محمد اسماعیل اور سید احمد شہید بریلوی کے عالم رفقاء کار کے قلم سے ہیں۔ یہ مسلم خواص کے لیے لکھی گئی تھیں دوسرا وہ حصہ ہے نظم و نثر میں جو کہ سید احمد شہید بریلوی کی تحریک سے

متعلق لوگوں نے ۱۸۵۷ء کے پہلے اور بعد میں مسلم عوام کی دینی اصلاح کے لیے لکھا تھا۔ اس لٹریچر کے مصنفین مختلف مقامات کا سفر بھی کرتے تھے اور وعظ و پند کے ذریعہ مسلمانوں میں غیر اسلامی رسومات اور دوسرے اثرات ختم کرنے کی جد وجہد میں مصروف تھے۔ اس لٹریچر کی خصوصیت ہے کہ اس میں دینی مسائل کو آسان ترین زبان میں پیش کیا گیا ہے اور اس کا مطالعہ ذہن کے بجائے جذبات کو متاثر کرتا ہے۔ شاہ محمد اسماعیل کی تقویت الایمان کے بعد مولانا خرم علی کی تصنیف "نصیحت المسلمین" مولانا حسن قنوجی کی تصنیف "ہدایت المومنین وسوالات عشرہ المحرم" اور مولانا کرامت علی جونپوری کی "حجت القاطع" معیاری کتابیں ہیں ان کا زمانہ طباعت ۱۸۵۲ء سے ۱۸۶۸ء ہے۔ اپنی مقبولیت کی وجہ سے ان کے ایڈیشن لاہور، دہلی اور کلکتہ سے چھپتے رہے۔

اس لٹریچر کے سلسلے میں اس بات کی بھی وضاحت ضروری ہے کہ تاریخ ہند اور اردو ادب کے محققین نے اس لٹریچر کو وہابی ادب کا نام دیا ہے[1] جو کہ ایک تاریخی غلطی ہے۔ کیونکہ اس لٹریچر کے مصنفین کا تعلق شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کے توسط سے شاہ ولی اللہؒ کی تحریک سے تھا اور ان افراد پر عرب کی وہابی تحریک کے بجائے شاہ ولی اللہ کی تعلیمات کا اثر تھا لہٰذا ان کی تحریک کو شاہ ولی اللہی تحریک کے نام سے موسوم کرنا چاہیے اور لٹریچر کو بھی شاہ ولی اللہی تحریک کا لٹریچر کہنا مناسب ہوگا۔

۱۸۵۷ء کے بعد ہندوی ہی اردو کہلائی جانے لگی۔ اگرچہ جدید نثر کی تاریخ کی ابتدا کلکتہ کالج کے اردو ترجموں اور شاہ عبدالقادر کے قرآن شریف کے ترجمہ سے ہوتی ہے لیکن اس کو جدید ترین بنانے کا سہرا سرسید اور اُن کے رفقاء کار کے سر ہے۔ سرسید کی تصنیفات عہد آفریں تھیں۔ اُن کی قرآن شریف کی تفسیر نے اردو میں علم الکلام

---

[1] خواجہ احمد فاروقی کی کتاب "اردو میں وہابی ادب" تحقیق کے اعلیٰ معیار پر اترتی ہے۔ انھوں نے برٹش لائبریری لندن اور انڈیا آفس لائبریری میں ۴۴ مخطوطات کو دریافت کیا اور ان کا تجزیہ پیش کر کے ثابت کیا کہ اردو زبان کی ترقی میں اس لٹریچر کی کیا اہمیت ہے۔ اچھا ہوتا کہ وہ کتاب کا عنوان "اردو میں شاہ ولی اللہی تحریک کا ادب رکھتے۔ فاروقی صاحب کی کتاب دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کی مطبوعات میں شامل ہے۔

کا آغاز کیا۔ مولانا شبلی نعمانی اگرچہ اپنی قدامت پسندی کی وجہ سے سرسید کے دینی افکار سے اختلاف رکھتے تھے اور انھوں نے قدیم مسلم متکلمین کے علمی کارناموں کو نمایاں کرنے کے لیے علم الکلام پر معیاری کام کیا لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس کی تحریک انہیں سرسید ہی کے کام سے ملی تھی اُن کے بعد سرسید کے افکار اور روایت سے مولانا آزاد اور مولانا مودودی بھی متاثر ہوئے۔ آخر الذکر نے شبلی نعمانی کے برعکس سرسید کی روشنی میں بدلے ہوئے زمانہ اور حالات کے تقاضوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے قرآن کی تفسیر اور ترجمانی کی ہے۔ سرسید کا تاریخ سے متعلق کام بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ علم الکلام کی طرح علم تاریخ اور فلسفۂ تاریخ کا بھی جدید تصورات اور اسالیب کے تحت مطالعہ کیا جائے۔ اس ضمن میں اُن کے افکار قدیم مسلم مورخین کے افکار سے مختلف تھے اس کے لیے علاحدہ مطالعہ کی ضرورت ہے۔

ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی کی تازہ پیش کش مولانا سید جلال الدین عمری کی ایک اہم کتاب

اسلام میں خدمتِ خلق کا تصور

خدمت خلق کا صحیح تصور۔ غلط تصورات کی تردید۔ خدمتِ خلق کا اجر و ثواب۔ خدمت کے مستحقین۔ وقتی خدمات۔ رفاہی خدمات۔ خدمت کے لیے انفرادی اور اجتماعی جدوجہد۔ موجودہ دور کے تقاضے۔ مصنف کے جاندار قلم نے ان تمام گوشوں کو نکھار دیا ہے۔

ایک اہم موضوع پر اردو میں پہلی مستند کتاب، ہر فرد اور ہر ادارہ کے لیے یکساں مفید۔ آفسٹ کی حسین طباعت، خوبصورت سرورق۔ ضخامت ۱۷۶ صفحات

قیمت صرف ۲۵ روپے

ملنے کے پتے

ادارۂ تحقیق۔ پان والی کوٹھی۔ دودھ پور۔ علی گڑھ

مرکزی مکتبہ اسلامی۔ بازار چتلی قبر۔ دہلی ۶